نسائی تنقید، مسائل و مباحث

Feministic Criticism - Problems and Discussion

Dr Uzma Farman Farooqui, Associate Professor, Department of Urdu, University of Karachi, Karachi, Pakistan.

Abstract:

The paper discusses about 'Feminism' and its different definitions. The paper gives the readers information regarding 'Feminism' history and the books related to it. It also provides us the list of 'Feministic literature' written in Urdu. In the end the paper discusses about the problems found in this genre of literature and provides the critics some suggestions in this regard. Holistically the paper arises some key questions for further discussion on this subject.

فیمی نزم (Feminism)، نسائیت یا تانیثیت ___ ان اصطلاحات کو سن کر کوئی منہ بنائے یا طنزیہ مسکرائے ___ ان اصطلاحات سے دامن چھڑا کر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ جلد یا بہ دیر آج کے ہر نقاد، طالب علم، شعر و ادب کے ہر قاری کا نسائیت / تانیثیت، نسائی شاعری، نسائی تنقید، فیمی نسٹ (Feminist) ادب جیسی اصطلاحات سے واسطہ پڑتا ہی رہے گا۔ اور پھر ایک سوال یہ اٹھتا ہے کہ آیا نسائی ادب جیسی کوئی چیز اپنا وجود بھی رکھتی ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو پھر میراں بائی سے مہ لقا چندا اور پروین شاکر تک۔ اکبری بیگم سے قرۃ العین حیدر، بانو قدسیہ اور زاہدہ حنا تک ___ ہر خاتون شاعر اور ادیب کے اسلوب میں کوئی روّیہ، کوئی زاویہ، کوئی آہنگ، کوئی لحن، کہیں نہ کہیں، ان کی نسائیت کی توثیق کیوں کر جاتا ہے؟ یقیناً یہ رویہ، یہ آہنگ نسائی حسیت اور نسائی شعور سے علاحدہ کوئی شے نہیں۔ دراصل یہ ہر عورت کی نسائی حسیت ہی ہے جو اس کا اسلوب مرد لکھنے والوں کے اسلوب سے ممتاز کر دیتی ہے۔ ادب کو اسی حوالے سے دیکھنا اور پرکھنا ہی نسائی تنقید ہے۔

نسائیت یا Feminism کی متعدد تعریفیں متعین کی جا چکی ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا میں Feminism کی ایک تعریف اس طرح ملتی ہے۔

"A social movement that seeks equal rights for women" [1]

ایک نقاد نے فیمی نزم (Feminism) کو ان مختلف تحریکوں اور نظریات کا ایک مجموعہ قرار دیا ہے جو

عورتوں کے حقوق سے متعلق ہیں۔ یہ تعریف خاصی جامع ہے کہ:

"Feminism is a discourse that involves various movements, theories and philosophies which are concerned with issues of gender difference, advocate equality for women and campaign for women right and interests". ۲

یہی بات مختصر اُلغت میں اس طرح لکھی گئی ہے کہ:

"Feminism is the theory of political, economic and social equality of sexes" ۳

نسائی تنقید کی طرف آیئے تو انگریزی میں ادبی نسائی تنقید کی ایک تعریف یوں لکھی گئی ہے کہ:

"Feminism literary criticism is literary criticism informed by feminist theory or by the politics of feminism, more broadly" ۴

جوڈتھ فیٹر لے جو خود بھی ایک اہم نسائی نقاد ہیں، نسائی تنقید کی تعریف متعین کرتے ہوئے اس کا دامن خاصہ وسیع کر دیتی ہیں۔ لکھتی ہیں:

"Feminism criticism is a political act whose aim is not simply to interpret the world but to change it by changing the consciousness of those who read and their relation to what they read" ۵

اس اعتبار سے نسائی تنقید، نظریاتی اور ادبی تنقید ہونے کے باوجود ایک وسیع تر عملی تحریک کا بھی حصہ ہے جس کا مقصد عورتوں کے لیے سازگار ماحول فراہم کرنا ہے اور جو فیمی نزم (Feminism) یا 'نسائیت' یا 'تحریکِ نسواں' کہلاتی ہے۔ تحریک کہلانے کے باوجود اس کے پیچھے تحریک کا وہ باقاعدہ منظم تصور موجود نہیں جیسا کہ ترقی پسند تحریک میں نظر آتا ہے نہ ہی Feminism کے تمام حلقے آج تک اس بات پر متفق ہو سکے ہیں کہ عورتوں کے لیے سازگار ماحول حاصل کرنے کا طریق کار کیا ہوگا۔ اسی لیے ہر شخص ''نسائیت'' کا ایک مخصوص نجی مفہوم ذہن میں رکھتا ہے۔ ہاں مجموعی طور پر چند رجحانات کی نشان دہی

ضرور کی جاسکتی ہے جو Feminist کہلاتے ہیں۔ ان رجحانات کے ارتقا کا جائزہ لیا جائے تو نقطۂ آغاز مغرب سے شروع ہونے والی وہ تحریک ہے جس کی ابتدا تو اٹھارویں صدی میں ہوچکی تھی، مگر دوسری جنگ عظیم کے بعد اس تحریک نے صحیح معنوں میں زور پکڑا اور عملی کامیابیاں بھی حاصل کیں ادب اور تنقید سے اس تحریک کا رشتہ ابتدا سے ہی قائم رہا اور خواتین ادیب اور شاعر اس کے ہراول دستے میں نظر آئیں۔

اس سلسلے میں پہلا اہم اظہاریہ ۱۷۹۲ء میں شائع ہوا جسے Mary Wollstone Craft نے تحریر کیا۔ اس کا عنوان تھا۔ ۶ "A vindication of the rights of women" اس کے تقریباً پچاس سال بعد، مارگریٹ فلر نے ۱۸۴۵ء میں "Women in the 19th century" ۷ لکھی۔ تین سال بعد ۱۸۴۸ء میں Senecafalls کنونشن میں عورتوں کے مساوی حقوق کا باقاعدہ مطالبہ کردیا گیا۔ ۸ اور ۱۸۶۹ء میں John Staurt Mill کی مشہور کتاب "The Subjection of Women" شائع ہوئی۔ ۹ جس کا ترجمہ افتخار شروانی ''عورتوں کی محکومیت'' کے نام سے کرچکے ہیں۔ ۱۰

اس کے بعد آزادیٔ نسواں کی یہ تحریک روز بہ روز زور پکڑتی گئی یہاں تک کہ ۱۹۲۰ء میں ایک آئینی ترمیم کے ذریعے عورت کو امریکہ میں ووٹ کا حق مل گیا۔ تاہم اس کے بعد بھی مغربی معاشرے میں، ملازمتوں میں عورت کی شمولیت محدود رہی۔ نوکری کے لیے عورت کا گھر سے باہر نکلنا ایک معیوب بات سمجھی جاتی تھی۔ بہ حالتِ مجبوری اگر کوئی عورت ملازمت کی تلاش میں نکلتی تو اسے صرف نچلے درجے کی نوکری، کم تر اُجرت پر دی جاتی۔ اور اس کے بعد بھی لاتعداد دشواریاں، اس کی زندگی کی کٹھن بنانے، اور اس کی عملی زندگی کا راستہ روکنے کے لیے کھڑی ہوجاتی تھیں۔ ۱۱ اس صورتِ حال میں ۱۹۶۹ء میں ورجینیا وولف نے اپنا مشہور مضمون "A room of one's own" تحریر کیا۔ ۱۲

جنگِ عظیم کے فوراً بعد سائمن ڈی بووا کی کتاب "The Second Sex" سامنے آئی جو Feminism کا بے حد اہم سنگِ میل سمجھی جاتی ہے۔ سائمن ڈی بووا نے عورت کے وجود سے متعلق متعدد مباحث چھیڑے۔ مثلاً یہ کہ ''عورت کیا ہے'' کیا عورت کا وجود قائم بالذات ہے یا پھر اضافی؟ یعنی کیا جنس مخالف کی موجودگی سے ہی اس کے وجود کا تعین ہوسکتا ہے؟ اور اگر تذکیر کے بغیر ثانیت کا تصور ممکن نہیں تو پھر اس قاعدے سے تانیث کے بغیر تذکیر کا صیغہ بھی مہمل ہے۔ تو پھر ایسا کیوں ہے کہ عورت ہی مرد کی نسبت سے پہچانی جاتی ہے اور مرد کے لیے عورت کی نسبت سے پہچانا جانا انتہائی ذلت کی بات سمجھی جاتی ہے۔

اپنی دوسری کتاب "Women: Myth and Reality" میں سائمن ڈی بووا عورت اور مرد کے

روایتی تصورات کو رد کر دیتی ہے اس کا خیال ہے کہ مرد کو اپنی مردانگی اور عورت کو اپنی نسوانیت جتانے یا ثابت کرنے کی چنداں ضرورت نہیں اس کے بجائے خصوصاً عورت، اپنے آپ کو انسان ثابت کرے تو بہتر ہوگا۔ کیوں کہ عورت، اس کے خیال میں پیدا نہیں ہوتی بن جاتی ہے۔[۱۱]

یہ اور بات ہے کہ سائمن ڈی بووا کو سارتر کے سائے سے الگ کرنے اور اس کا الگ وجود منوانے کے لیے بھی Feminist نقادوں کو ایک طویل لڑائی لڑنی پڑی۔ بہر حال سائمن ڈی بووا کی تحریروں نے نسائیت کی بحث کا رشتہ وجودیت اور نفسیات سے جوڑ دیا۔ بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں مغرب میں نسائی نقادوں کی کئی اہم تحریریں سامنے آئیں اور پھر ان میں مسلسل اضافہ ہوتا گیا جو آج تک جاری ہے۔

Mary Ellman کی کتاب Thinking about Women مطبوعہ ۱۹۶۸ء۔ Kate Millet کی Sexual Politics مطبوعہ ۱۹۶۹ء، جوڈھ فیٹر لے کی The Resisting Reader مطبوعہ ۱۹۷۷ء اور Elaine Showalter کی کتاب A literature of their own مطبوعہ ۱۹۷۷ء، نسائیت/Feminism کے حوالے سے بے حد اہم کتابوں میں شمار ہوتی ہیں۔

Elaine Showalter نے مغرب میں نسائی تنقید کے ارتقا کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی کتاب The New Feminist Critcism میں اسے تین مراحل میں تقسیم کیا ہے۔[۱۲]

i۔ پہلا دور وہ ہے جسے شوآلٹر Feminist Criticism کا نام دیتی ہے۔ اس دور میں نسائی تنقید صرف اس حد تک وجود رکھتی ہے کہ نسائی رجحانات رکھنے والا/ والی قاری ادب اور ادیب کے تصورات اور افکار کا تجزیہ کر سکتا ہے۔

ii۔ دوسرا دور Gynocritcism کا ہے جس میں نسائی نقاد متن کی تعبیر خود کرتے ہیں اور ایسا کرتے ہوئے وہ نسائی تخلیقی عمل، نسائی زبان اور نسائی ادب کی تاریخ کو پیش نظر رکھتے ہیں۔

iii۔ تیسرے اور آخری مرحلے کو وہ Gender theory کا دور قرار دیتی ہے۔ اس عہد میں خصوصی توجہ نظریاتی بحث پر دی جاتی ہے۔ جنس یا Gender کی بنیاد پر قائم نظام کس طرح زبان، ادب اور انسانی فکر و فلسفہ پر اثر انداز ہوتا ہے۔ یہ سب اس دور کے مباحث ہیں۔

اگر چہ شوالٹر کی Gynocriticism جیسی اصطلاحات نے خاصی مقبولیت حاصل کی تاہم نسائیت کا ارتقاء مغربی مورخ عام طور پر Wave concept کے ذریعے بیان کرتے ہیں۔[۱۳]

شوالٹر کی تقسیم درست ہوتے ہوئے بھی ایک لگی بندھی، روایتی اور جامد تقسیم معلوم ہوتی ہے اور اس عمل کو سمجھنے کے لیے ناکافی بھی۔ جس میں ایک ہی عہد کے دو نقاد اپنی تنقید کے اعتبار سے دو الگ الگ

ادوار کے نقاد ہو سکتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں Waves کا تصور بہتر معلوم ہوتا ہے۔

Alvin Toffler کا مشہور جملہ ہے کہ

"The future is fluid, not frozen. We stand at the new age of synthesis." ۱۵

Wave یا تموج کے اس نظریے کے مطابق مغرب میں نسائی تحریک کے سمندر میں تین امواج نظر آتی ہیں۔

i۔ پہلی اور دوسری امواج (Waves)، ستر کی دہائی میں اپنی عروج پر پہنچیں۔ اس عہد میں نسائی نقاد کی دل چسپی دو موضوعات سے زیادہ نظر آتی ہے۔ ایک یہ کہ (الف) ادب میں عورتوں کی پیش کش اور دوسرے (ب) تاریخِ ادب میں عورتوں کے ناموں کی تلاش۔

ii۔ تیسری موج یا (Wave) میں جو ابھی تک جاری ہے، نسائی نقاد مذکورہ بالا موضوعات پر کام کے علاوہ نظریاتی مباحث بھی اٹھاتے ہیں۔ Feminism کے تضادات و ابہامات پر گفتگو کرتے ہیں، نسائی آوازوں کی انفرادیت اور انفرادی شناخت کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور نسائیت کا رشتہ سماجی علوم سے لے کر فنونِ لطیفہ Fine Art تک ہر شعبۂ علم سے جوڑ چکے ہیں۔

نفسیات سے تو نسائیت کا رشتہ اس لیے سب سے پہلے جوڑا گیا کہ ایک Feminist حلقے نے فرائڈ اور Lacan کے نظریات کو فیمی نزم (Feminism) کے حق میں خصوصیت سے استعمال کیا۔ اس حلقے کا کہنا ہے کہ تذکیر و تانیث یا Gender کا تعین حیاتیاتی (Biological) بنیادوں پر نہیں بلکہ نفسیاتی بنیادوں پر کیا جاتا ہے۔ معاشرے میں رائج دیرینہ تصورات اور رسومات، تذکیر و تانیث کا فرق پیدا کر دیتے ہیں۔ سیاست اور طاقت سے وابستہ رشتے اس تفریق کو ہوا دیتے ہیں اور یوں معاشرے میں وہ نظام مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا جاتا ہے جس کی بنیاد تفریق اور عدم مساوات پر رکھی گئی ہے۔

اسی طرح ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ پیداواری ذرائع Gender System تشکیل دیتے ہیں اور یہ سسٹم سیاست، تہذیب، تاریخ ہر چیز پر اثر انداز ہوتا ہے ان معاملات کا مطالعہ نسائی مورخ کا کام ہے مگر تاریخ کے وہ پہلو جو عورتوں سے متعلق تھے، قابلِ اعتنا نہیں سمجھے گئے، ان کو مناسب اہمیت دلانا، تاریخ کے اہم فیصلوں میں عورتیں کسی حد تک دخیل رہیں اور اگر دخیل نہیں رہیں تو کیا ان کی فیصلوں میں شمولیت سے تاریخ کا رُخ بدل سکتا تھا؟ ان سوالات کے جوابات تلاش کرنا بھی ایک نسائی یا Feminist مورخ کی ذمہ داری ہے۔

عالمگیریت کے اس عہد میں جب کہ ٹیکنالوجی نے فاصلے ختم کر کے رکھ دیے ہیں، تمام علوم و

فنون ایک دوسرے کو Overlap کرتے نظر آتے ہیں۔ لہٰذا نسائیت نے تاریخ، معاشیات، فلسفہ، زبان، غرض یہ کہ ہر شعبہ سے نہ صرف تعلق قائم کرلیا ہے بلکہ Women Studies، Geneder Studies یہاں تک کہ Queer Studies کی حیثیت سے ایک علاحدہ سماجی علم کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔

اس درجہ وسعت اور اہمیت اختیار کرلینے کے باوجود اس جنوبی ایشیائی خطے میں Feminism کی اصطلاح ایک نئی چیز ہے اس قدر نئی کہ ابھی تک ہم اس کے اُردو مترادف پر اتفاق رائے بھی نہیں کرسکے۔ لیکن نسائیت سے وابستہ رجحانات اور خیالات جنوبی ایشیا کے اس خطے میں نئے نہیں ہیں۔ البتہ یہاں تحریکِ آزادی نسواں کی نوعیت مغرب سے کافی مختلف رہی۔ Feminist نظریات میں بھی، اس خطے میں وہ الجھاؤ یا تندی نظر نہیں آئی جو مغرب میں نظر آئی۔ غرض یہ کہ اس خطے کے اُردو ادب میں جو نسائی رجحانات ابھرے وہ دنیا بھر کی Feminist تحریکوں سے متصل ہونے کے باوجود ممتاز و منفرد تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اس خطے میں عورت کی اپنی تہذیب و تاریخ سے جس نوعیت کی وابستگی رہی، اور جتنی قدیم وابستگی رہی، اس کی مثال دنیا کے کسی اور حصے میں نہیں ملتی۔

کہا جاتا ہے کہ:

> ''قدیم ہند میں ہزاروں برس مادرسری نظام رائج رہا بلکہ بعض مورخین کے مطابق دنیا کے بہت سے ملکوں میں مادرسری نظام ہندوستان سے گیا۔[۱۶]

اس مادرسری نظام میں دھرتی کو ماں کا درجہ حاصل تھا۔ پرا کرتی دنیا کو تخلیق کرنے والی مقدس دیوی تھی۔ (اسی دیوی کو آج مغرب میں Mother Nature کہا جاتا ہے) آریاؤں کی آمد سے پہلے، اس خطے کے اہم فیصلے عورت کے ہاتھ میں تھے۔ عرصے تک یہاں کی تہذیب اور تمدن عورت کے ہاتھوں پروان چڑھا۔ آریاؤں کی آمد کے ساتھ ہی پیداواری ذرائع میں انقلاب آ گیا۔ دھرتی سے زیادہ اہمیت، ہل بیل نے حاصل کرلی۔ تخلیق کا دیوتا، برہما تری مورتی میں تو شامل رہا مگر اس کی علاحدہ پوجا ممنوع قرار دے دی گئی۔ اس کے مقابلے میں وشنو اور یشو، تحفظ اور قوت کے دیوتا پہلے سے زیادہ اہمیت اختیار کر گئے اور یوں ایک پدرسری معاشرہ قائم ہوگیا۔

اس پدرسری معاشرے میں عورتوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے امتیازات کی انتہائی صورتیں نظر آئیں۔ مثال کے طور پر معاشرے میں ستی جیسی رسومات رواج پا گئیں۔ حالانکہ ہندومت کی کسی کتاب میں ستی کا حکم موجود نہیں اس کے باوجود ڈاکٹر مبارک علی لکھتے ہیں کہ:

> ''ستی کی پہلی یادگار ۵۱۰ء میں مدھیا پردیش کے شہر اران میں ملتی ہے۔ ستی کی رسم کے پس منظر میں عورت کی سماجی حیثیت ابھر کر [سامنے] آتی ہے کہ آہستہ آہستہ اب اس کی اپنی

ذات اور اس کی شناخت ختم ہوتی جاتی ہے اور وہ مکمل طور پر مرد کی ملکیت ہو جاتی ہے۔ اس لیے شوہر کی وفات کے بعد اس کے لیے زندہ رہنے کا کوئی جواز نہیں رہتا۔ ۱۷

اس جگہ ٹھہر کر تصویر کا دوسرا رُخ دیکھ لینا بھی مناسب معلومات ہوتا ہے۔ عورت کی سماجی یا انفرادی حیثیت کو مٹا دینے کی یہ کوشش مرد طبقے کی جانب سے ایک نوع کا ردِ عمل یا انتقام تھا۔ مورخین لکھتے ہیں کہ مادر سری معاشرے میں مردوں کے استحصال اور نسوانی ظلم و استبداد کی بے شمار صورتیں مروج تھیں۔

قربانی کے قانون کی ایک مثال ڈاکٹر مہر عبدالحق اپنی کتاب ''ہندو ضمیات'' میں درج کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ:

''حکم یہ ہے کہ شہزادے، مملکت کے وزراء، کونسلر اور شراب بیچنے والے آسودہ حالی اور دولت حاصل کرنے کے لیے دیوی کے سامنے قربانی پیش کریں اور دیوی کو جو شکار پیش کیا جاوے وہ اگر انسان ہے تو پچیس سال کا ہو۔'' ۱۸

یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ اس معاشرے میں عورت کی قربانی قطعاً ممنوع تھی۔

اسی طرح بے شمار قوانین ایسے موجود تھے جو مردوں کا سماجی رتبہ اور اختیار تقریباً ختم کر دیتے تھے۔ ڈاکٹر مہر الحق لکھتے ہیں کہ اگرچہ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے لیکن آج بھی بعض پجاری دیوی کو خوش کرنے کی غرض سے اپنا جسم کاٹ ڈالتے ہیں یا جلا لیتے ہیں یہ اسی مادر سری نظام کی نشانی ہے۔

نتیجۃً جب مرد راج ہوا تو کم سن لڑکیوں کی شادی، کنواریوں کی قربانی اور ستی جیسی رسومات پروان چڑھیں یوں ایک طرف عورت دیوی بھی تھی تو دوسری طرف وہ پاؤں کی جوتی بھی تھی۔

یہاں ایک سوال یہ اُٹھتا ہے کہ کیا واقعتاً قدیم ہند میں عورت کے یہی دو انتہائی تصورات ذہنوں میں موجود تھے یا ان دو انتہاؤں کے درمیان بھی عورت کی کوئی تصویر ملتی ہے۔ اس سوال کا جواب شاید گوتم بدھ کے اس اقتباس سے مل سکے۔ گوتم بدھ بیویوں کی سات اقسام بتاتے ہیں:

۱۔ پہلی قسم کی بیویاں گھاتک کہلاتی ہیں۔ ان کا برتاؤ ٹھیک قاتل کا سا ہوتا ہے۔ ایسی عورتیں روز نئے آشنا کی تلاش کرتی ہیں اور اپنے خاوند کے ساتھ بے وفائی کرتی ہیں۔

۲۔ دوسری قسم کی عورتیں چور ہوتی ہیں۔ اپنی تمام کاروائیوں کا مرکز خود ہوتی ہیں۔ انھیں اپنے خاوند سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی اور صرف اپنے سکھ چین سے ہی غرض رہتی ہے۔

۳۔ تیسری قسم کی بیوی شوہر کو اپنا نوکر یا غلام سمجھتی ہیں۔

۴۔ چوتھی قسم کی عورتیں اپنے شوہروں کے ساتھ ماں کا برتاؤ کرتی ہیں اس کی تمام ضرورتوں کو سمجھتی اور پورا کرتی ہیں۔

۵۔ پانچویں قسم کی عورتوں کا شوہر سے بہنوں کا سا برتاؤ ہوتا ہے وہ شرم اور پریم کا مجسمہ ہوتی ہیں۔

۶۔ چھٹی قسم کی عورتیں اپنے خاوند کو دوست سمجھتی ہیں اسے خوش رکھنے کی کوشش کرتی ہیں اور دکھ درد میں برابر کی شریک ہوتی ہیں۔

۷۔ ساتویں قسم کی عورتیں اپنے آپ کو خاوند کا غلام سمجھتی ہیں اور اس کی ہر خدمت بجالاتی ہیں۔ وہ اپنا سب کچھ اپنے شوہروں پر قربان کر دیتی ہیں اور اس کی سیوا کو اپنا دھرم مانتی ہیں۔[19]

اگر چہ یہ ساتویں قسم کی عورت آج تک اس خطے کے مردوں کی آئیڈیل عورت سمجھی جاتی ہے لیکن یہ ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ ہر عورت عہدِ قدیم میں غلام کا درجہ نہیں رکھتی تھی اور یہ بھی کہ غالباً ماں اور بہن کا درجہ بیوی سے نسبتاً بلند رہا ہوگا۔ جو بھی ہو وفا پرستی اور وفا شعاری کے لیے اس خطے کی عورت کی مثالیں آج بھی دی جاتی ہیں اور وفا کے پیکر کا یہ تصور، مرد تو مرد خود عورت کو بے حد عزیز ہے۔

ترک اور مغل اس خطے میں آئے تو جو تہذیب ساتھ لائے اس میں عورت کی حالت بہت بہتر تھی۔ ابتدائی تعلیم کے لیے لڑکیوں کو مکتب جانے کی اجازت تھی اس کے بعد گھر میں اس کی تعلیم کا بندوبست کیا جاتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس حوالے سے وسط ایشیا سے آنے والے مسلم گھرانوں کی اقدار اس وقت کے یورپ سے بھی بہتر نظر آتی ہیں۔ اس موضوع پر عابدہ سمیع الدین کی مرتبہ، مفصل کتاب موجود ہے جس کا عنوان ہے:

"Feminism & Feminist Movement in Central Asia"[20]

۲۰۰۳ء میں شائع ہونے والی یہ کتاب ۴۱۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ عابدہ سمیع الدین ایک انتہائی اہم نسائی مورخ ہیں اور ان کی خصوصی توجہ جنوبی ایشیا کے مسلم گھرانوں کی خواتین کی تاریخ پر رہی ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے بڑا قابلِ قدر مواد اکٹھا کر دیا ہے۔ اس کتاب میں اسلام میں نسائیت/ Feminism کے تصور پر بات کی گئی اور وسط ایشیا یعنی افغانستان، آزربائیجان، قازقستان، تاجکستان اور ازبکستان کے خطے میں نسائیت کی تحریک کا جائزہ مسلم معاشرے کے حوالے سے لیا گیا ہے۔

اس کتاب کے علاوہ فہمیدہ ریاض کے وہ لیکچرز جو انھوں نے ۱۹۹۳ء میں برطانیہ میں دیے اور جو فاطمہ حسن کی کتاب ''فیمی نزم اور ہم''[21] میں شامل ہیں، اسی موضوع پر ہیں۔ فہمیدہ ریاض نے ان لیکچرز میں خاص طور پر اس نکتے کو اٹھایا ہے کہ Feminism مسلم گھرانوں کا یا یوں کہیے کہ اسلامی ورثہ کا اہم حصہ ہے۔ فہمیدہ ریاض نے اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ فیمی نزم (Feminism) کا رجحان طبقہ بالا یا Elites میں ہی نہیں عوام کی زندگی کا بھی حصہ تھا۔

اسی طرح نگہت سعیدی کی مرتبہ کتاب Unveiling the Issues[۲۲] اور ASR گروپ کی جانب سے شائع ہونے والی دیگر کتابوں میں بھی کئی جگہ اس بات کو موضوع بنایا گیا ہے کہ اسلام میں Feminism کے رجحانات کس حد تک موجود ہیں اور وسط ایشیا سے ہندوستان آنے والے مسلم گھرانوں میں عورتوں سے متعلق کیا اقدار موجود ہیں۔

اس بات پر سب ہی اتفاق کرتے نظر آتے ہیں کہ ہندوستان آنے والے مسلم گھرانوں میں عورتوں کی تعلیم و تربیت کی بڑی صحت مند روایات موجود ہیں اور اس سے اہم اور غیر اہم فیصلوں میں بھی مشاورت کی جاتی تھی۔

ادھر ہندوستان میں بعض اقوام مثال کے طور پر راجپوت قوم میں عورتوں کی تعلیم، یہاں تک کہ جنگی تربیت کی بھی روایت رہی۔

وقت کے ساتھ ساتھ سامراجی قوتیں، اس پدرسری معاشرے کے ساتھ مل کر ان تمام صحت مند، مثبت اقدار کو مٹاتی چلی گئیں اور شعوری یا لاشعوری طور پر عورت کی ہر اس کوشش کو دبایا جاتا رہا جس کے ذریعے وہ اپنی کھوئی ہوئی شان و شوکت حاصل کر سکتی تھی۔ ایسے جبر کے باوجود، نسائیت میں گندھی ہوئی اس تہذیب نے اپنی اظہار کی کوئی نہ کوئی صورت تلاش کر ہی لی۔ فضلی کی بکٹ کہانی ہو یا امیر خسرو کے گیت، ان میں تہذیب میں رچی بسی نسائیت صاف صاف نظر آتی ہے۔ امیر خسرو کے دو اشعار دیکھیے:

شبان ہجراں دراز چوں زلف، و روزِ وصلش چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کوں جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

یکایک از دل دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکیں
کسے پڑی ہے جو جاسناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں

اور پھر یہ دوہا ملاحظہ فرمائیے:

گوری سووے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے سانج بھئی چوں دیس

ان اشعار پر ایک نظر ڈالنے سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس عہد کے عشق و معرفت اور کام اور دھرم کے سارے فلسفے اور سارے سلسلے اسی ایک فکر سے ملتے ہیں جسے نسائیت کہتے ہیں۔ شاہد ہو یا مشہود، مراد ہو یا مرید، حقیقت ہو یا مجاز بنیادِ گفتگو نسائی حسیت اور نسائی شعور ہے۔

بیسویں صدی میں جنوبی ایشیا میں مغربی خیالات و افکار تیزی سے عام ہوئے لیکن ان جدید خیالات کے نتیجے میں ہونے والی اصلاحات اور اقدامات کے ثمرات کو خواتین تک پہنچنے میں خاصی دیر لگی۔ خواتین کی تعلیمی ترقی کی جدوجہد کی ایک علاحدہ داستان ہے جس میں نذیر احمد کے ناول اور حالی کی ''چپ کی داد'' سے لے کر جسٹس امیر علی، یلدرم، شیخ عبداللہ، ممتاز علی تک کئی مردوں کے نام نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کے ساتھ نذر سجاد، محمدی بیگم، بیگم ممتاز علی (اعلیٰ بی)، بیگم شیخ عبداللہ بھی ہیں جو مرد رفقاء سے کسی طرح پیچھے نہیں۔ ان سب کی عملی کوششوں اور پاک و ہند میں تبدیل ہوتی ہوئی سیاسی فضا نے بالآخر علم و ادب، شعر و سخن، سیاست و معاشرت سب حوالوں سے عورتوں کی زندگی میں بھی بھرپور شرکت کو ممکن بنا دیا۔

نشاط النسا بیگم (بیگم حسرت موہانی)، بی اماں امجدی بیگم، سعادت بانو کچلو، بیگم ابوالکلام آزاد، بیگم نواب، اکبری بیگم، نذر سجاد، حجاب امتیاز علی، زاہدہ خاتون شروانی، رشید جہاں، عصمت چغتائی، یہ سب خواتین مغربی Feminism سے واقف ہوں یا نہ ہوں، اپنے اندر ایک Feminist ذہن ضرور رکھتی ہیں۔ وہ اس لیے کہ ان سب نے اپنی اپنی جگہ معاشرے میں رائج عورتوں کے روایتی گھریلو تصور کو رد کر دیا۔ عملی طور پر سیاست یا سماجی کاموں میں شرکت یا ادب کے میدان میں آنے کا فیصلہ کیا اور ایک بڑی تبدیلی میں اپنا کردار ادا کیا۔ یہ خواتین ایک طرف اس نسائی روایت کی امین تھیں جس کی بنیاد قدیم ہندوستان میں پڑی تو دوسری طرف یہ مغرب کے زیرِ اثر آنے والے Feminist رجحانات کے لیے بھی راستہ ہموار کر رہی تھیں۔

نسائی روایت کی ترتیب و تدوین اور اس روایت کے گم شدہ ناموں کی بازیافت کی طرف نسائی محققین کی خاص توجہ رہی ہے۔ ان محققین اور ناقدین میں سے بیش تر خواتین ہی ہیں۔

راقمہ کی کتاب ''اُردو کی ادبی تحقیق و تنقید میں خواتین کا حصہ'' میں ۱۹۹۷ء تک خواتین کے سامنے آنے والے تحقیقی و تنقیدی کاموں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس وقت نسائیت کے حوالے سے سامنے آنے والی صرف چند کتابوں کا تذکرہ ضروری ہے جو پچھلے دس بارہ سالوں میں سامنے آئی ہیں۔ ان میں ڈاکٹر فاطمہ حسن نے حال ہی میں ایک کتاب ''فیمی نزم اور ہم'' کے عنوان سے مرتب کی ہے اس کتاب میں خواتین شعراء اور ادیب زخ ش۔ شمس الدین شرم، رشید جہاں، عصمت چغتائی، ممتاز شیریں، فہمیدہ ریاض، اور کشور ناہید پر تنقیدی مضامین ہیں۔ ڈاکٹر تنویر انجم کا عصمت پر مضمون خاص طور پر اسی کتاب کے لیے تحریر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ صغریٰ مہدی کا مضمون ''اُردو

ناولوں میں عورت''، سعدیہ بلوچ کا ایک نوٹ، فہمیدہ ریاض کے لیکچروں کے اقتباسات اور عطیہ داؤد کا ایک سوانحی مضمون اس کتاب کا حصہ ہیں۔

عابدہ سمیع الدین کی مرتبہ کتاب Muslim Feminism & Feminist Movement کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے۔ اس موضوع پر انگریزی میں کئی کتابیں موجود ہیں تاہم ہماری توجہ اس وقت ان کتابوں پر ہے جو اُردو میں شائع ہوئیں۔

شبنم شکیل، خالدہ حسین اور آصف فرخی نے ایک کتاب ''خواتین کی شاعری میں عورتوں کے مسائل کی تصویر کشی'' کے عنوان سے ترتیب دی۔ یہ کتاب ۲۰۰۵ء میں منسٹری آف ویمن ڈیولپمنٹ نے اسلام آباد سے شائع کی۔ ڈاکٹر سلیم اختر کچھ عرصے سے تسلسل کے ساتھ نسائیت پر لکھ رہے ہیں۔ اسی طرح خواتین کے عالمی ادب کا ایک انتخاب خالدہ حسین، کشور ناہید اور آصف فرخی نے مرتب کیا جو اکادمی ادبیات نے اسلام سے ۲۰۰۷ء میں شائع کیا۔ اکادمی ادبیات، اسلام آباد سے ہی یاسمین حمید کی کتاب ''تخلیقی عمل اور اُردو شاعری'' نسائی تناظر میں، ۲۰۰۷ء میں شائع ہوئی۔

ڈاکٹر عصمت جمیل کی کتاب ''اُردو افسانے میں عورت کا تصور'' اور ڈاکٹر عقیلہ جاوید کی کتاب ''اُردو ناول میں تانیثیت'' بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان کے شعبۂ اُردو نے بالترتیب ۲۰۰۱ء اور ۲۰۰۵ء میں شائع کیں۔

یہاں کوئی تحقیقی فہرست مرتب کرنا مقصد نہیں ہے صرف ایک سرسری جائزہ اس لیے مقصود تھا کہ نسائی تنقید و تحقیق کے حوالے سے موضوع رجحانات کا اندازہ ہو سکے۔ پچھلے پندرہ سے بیس سال کی اُردو کی نسائی تنقید پر نظر ڈالی جائے تو کچھ واضح رجحانات نظر آتے ہیں۔

i۔ سب سے نمایاں رجحان جو نسائی تنقید لکھنے والوں کے ہاں نظر آتا ہے وہ ہے خواتین کی تحریری روایت کی تلاش اور اس کی حفاظت۔ ادب اور ادب کے ہر شعبے میں یعنی شاعری، افسانہ، ناول، سوانح ہر صنف میں خواتین کی تحریریں تلاش کی جا رہی ہیں اور اس روایت کی تاریخ بھی مرتب کی جا رہی ہے۔

ii۔ دوسرا رجحان ادبی سرمائے خصوصاً کلاسیکی ادبی سرمائے کے نسائی نقطۂ نظر سے مطالعے، کا ہے۔ اس ضمن میں نسائی ناقدین کے جو پسندیدہ موضوعات نظر آتے ہیں اب ان میں کلاسیکی اُردو ادب میں عورت کی پیش کش، اُردو ادب کے فکشن، نان فکشن اور شاعری میں نظر آنے والے اہم نسوانی کرداروں کا تجزیہ، ادب میں نسائی معاشرے کی عکاسی وغیرہ شامل ہیں۔

بعض ناقدین نے ادب میں موجود پدرسری معاشرے کے اثرات اور Gender Politics کی نشاندہی بھی کی لیکن اس پر مزید کام کرنے کی گنجائش اب بھی موجود ہے۔

یہ بھی نسائیت کے رجحانات کا حصہ ہے کہ خواتین شعراء یا نثر نگاروں کا بھی از سرِ نو مطالعہ کیا جارہا ہے اور خواتین کے نسائی رجحانات کا تجزیہ ہورہا ہے۔

اس حوالے سے ایک اور رجحان کا تذکرہ بھی ہوسکتا ہے جو تنقید نگاروں میں نظر آتا ہے اور کہیں کہیں ان کی تنقید میں بھی در آتا ہے وہ یہ کہ ہمارے نقاد، مرد تو مرد خواتین بھی Feminist رجحانات رکھنے کے باوجود اپنے آپ کو Feminist کہلوانے سے کتراتی ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ شاید یہ ہے کہ Feminism کسی ایک نظریے کا نام نہیں بلکہ ان سب نظریات کا مجموعہ ہے جو عورتوں کے مساوی حقوق کی حمایت کرتے ہیں۔ اس صورت حال میں کچھ ابہام بھی پیدا ہوجاتے ہیں اور بعض چیلنج بھی سامنے آتے ہیں۔ آج کے نسائی نقاد کا ایک اہم فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ ان ابہامات کو دور کرے تاکہ خواتین کے لیے ایک حوصلہ افزا فضا تیار ہوسکے۔

ایک بڑی غلط فہمی جو عرصے تک نسائیت کے بارے میں لوگوں کے ذہنوں میں پائی جاتی تھی اور ہمارے سماج میں آج بھی ہے وہ یہ ہے کہ Feminism مردوں کے خلاف کوئی تحریک ہے۔ ابتدائی دنوں میں بعض Feminist عورتوں کے ہاں اس طرح کا رویہ ضرور دیکھنے میں آیا لیکن آہستہ آہستہ یہ جذباتیت ٹھنڈی پڑگئی۔ ہاں بعض اوقات نسائی ادیب کے لہجے میں ایک جھنجھلاہٹ ضرور نظر آجاتی ہے جو اپنی بات سمجھا نہ سکنے کا نتیجہ ہوتی ہے لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے کہ فیمی نسٹ (Feminist) عورتیں ہر آندھی، طوفان، بارش یا زلزلے کا ذمہ دار مرد کو ٹھہراتی ہوں۔

شمس الرحمٰن فاروقی صاحب جب یہ سوال کرتے ہیں کہ:

> ''کیا تانیثی تنقید کے ذریعے عورت اپنے مادری نظام کے کھوئے ہوئے شجرہ نسب کو حاصل کرسکتی ہے؟''

تو اس سوال کے پیچھے بھی (معذرت کے ساتھ) پدرسری معاشرے کا خوف نظر آتا ہے۔ اسے خدشہ ہے کہ کہیں عورت اپنی عظمتِ رفتہ کی، اپنے تاج وتخت کی دعوے دار بن کر تو سامنے نہیں آگئی؟ یہ خدشہ شاید اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ Feminist متواتر پدرسری معاشرے کی مذمت کرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن اُردو ادب میں، شاعری اور تنقید میں کہیں اس نوعیت کی قرار داد نظر نہیں آتی کہ اس پدرسری معاشرے کی جگہ ایک مادرسری معاشرہ قائم ہونا چاہیے۔ آج کی عورت تو ہر جگہ مساوات پر مبنی ایک

معاشرے کی بات کرتی نظر آتی ہے۔

اسی طرح یہ خیال بھی پایا جاتا ہے کہ نسائیت کے موضوع پر صرف خواتین لکھنے والوں کی اجارہ داری ہے۔ مرد نسائی حسیت یا نسائی شعور نہیں رکھتے لہٰذا نہ وہ آج تک عورت کو سمجھ سکے نہ اس کے ادب کو۔

اس بات میں کسی حد تک حقیقت بھی ہے کہ ہزار ہا سال سے پدرسری معاشرے میں رہنے کی وجہ سے نسائی شعور کو زنگ لگ گیا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ عورت خود بھی نسائیت کے بعض پہلو سمجھنے سے قاصر ہے۔ لیکن عورت بہر حال انسان ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں کہ:

> ''عورت نہ تو مافوق الفطرت ہے، نہ اساطیری شخصیت، نہ ہی پہیلی اور نہ چیستاں۔ وہ گوشت پوشت کا پیکر ہے، وہ بھی اعصاب اور غدودوں کی کارکردگی کے تحت عمل اور ردِ عمل کا اظہار کرتی ہے۔ یہی نہیں مرد کی طرح وہ بھی معاشرے کی فرد ہے۔''[۲۳]

تو جب برس ہا برس سے عورت مرد کے بنائے ہوئے اصول و معیارات، اقدار و روایات، یہاں تک کہ افکار و فلسفہ ہائے حیات بھی سمجھتی اور برتتی چلی آ رہی ہے تو مرد ایسا کیوں نہیں کر سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ مرد ایسا کر سکتے ہیں اور کرتے بھی ہیں۔ دنیا میں جہاں جہاں عورتوں کے حقوق کی تحریکوں نے کامیابیاں حاصل کی ہیں وہاں ان کامیابیوں کے پیچھے عورتوں کے ساتھ مردوں کا بھی ہاتھ تھا۔ آج کی عورت بہ خوبی جانتی ہے کہ جس طرح سفید فاموں کے ووٹ کے بغیر اوباما امریکہ کے صدر منتخب نہیں ہو سکتے تھے، اسی طرح مردوں کی شمولیت کے بغیر عورتوں کے حقوق کی تحریک بھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔

دوسری جانب مرد طبقہ بھی اس کا ادراک کرتا جا رہا ہے کہ پدرسری معاشرہ ختم کر کے وہ کوئی قربانی نہیں دیں گے بلکہ ایک ایسا معاشرہ جس کی بنیاد مساوات اور عدل پر ہو مرد اور عورت دونوں کی ضرورت ہے اسی ادراک و فہم کی وجہ سے آج کئی مردانہ نام بھی نسائیت کے لیے لکھنے والے میں موجود ہیں۔ ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ابوالکلام قاسمی، شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر سحر انصاری، شمیم حنفی، محمود ہاشمی، باقر مہدی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، فتح محمد ملک، غرض یہ کہ اُردو تنقید کے کئی معتبر نام نسائی ادب کی تنقید کی طرف متوجہ ہو چکے ہیں اور ان میں سے تو بعض نے نسائیت کے نظریاتی مباحث بھی اٹھائے ہیں۔

بعض اوقات یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ نسائیت کو نسوانیت اور نسوانیت کو غنائیت اور رومانس کے مترادف کے طور پر استعمال کر لیا جاتا ہے یہ ایک علاوہ موضوع ہے کہ عورتیں رومانس اس قدر شوق

سے کیوں پڑھتی ہیں؟ لیکن نسائیت کے نظریات اور رجحانات کو رومانس کی ذیل میں رکھ دینا بڑی غلطی ہے۔ Feminist کی بنیاد ہی حقیقی اور عملی زندگی پر ہے۔ ارضی حقیقتوں کا تجزیہ اور ان سے جڑے مسائل یہی نسائی ادیب کا موضوع ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ وہ چیزوں کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔

ایک غلط فہمی، بالخصوص پاکستان میں، نسائیت سے متعلق یہ بھی رہی ہے کہ یہ طبقۂ اعلیٰ یا Elites کا ایک فیشن ہے اور بس۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ تعلیم، انصاف، صحت سے لے کر شعر و ادب تک ہر چیز صرف طبقۂ اعلیٰ کی دسترس میں ہے ورنہ نسائیت کا نظریہ تو بنیادی طور پر طبقاتی نظام کو ہی رد کر دیتا ہے اور آج تک نسائیت کی تحریک کی سب سے بڑی رکاوٹ سرمائے یا جاگیر کی غیر مساوی تقسیم ہی رہی ہے جو Gender کے مسئلے کو اقتصادی مسائل میں الجھا کر مزید پیچیدہ کر دیتی ہے۔

نسائی نقاد کے سامنے ایک بڑا چیلنج یہ نظر آتا ہے کہ وہ ادب میں تخصیص کی مخالفت کرتے کرتے کہیں خود بھی لیڈیز کمپارٹمنٹ بنانے نہ لگ جائے۔ ادبی تاریخ میں عورتوں کے حصے کا اعتراف و سپاس ایک چیز ہے اور انھیں مجموعی دھارے Mainstream سے الگ کر دینا دوسری بات ہے۔

اس جگہ وہ بحث اُٹھ کھڑی ہوتی ہے کہ کیا ہم نے ادب میں کوئی Elite کلاس تشکیل دے دی ہے؟ کیا ادب میں صف بندیاں ہوتی ہیں؟ اس بحث کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں ہے لیکن اس صف بندی کی سیاست میں خواتین قلم کاروں کا مسئلہ بڑی گھمبیر صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہ مسئلہ قرۃ العین حیدر کا نہیں جو بلا روک ٹوک پہلی صف، بلکہ اس سے بھی آگے جا کھڑی ہوتی ہیں۔ مسئلہ تو ان خواتین کا ہے جو صفِ اوّل میں جگہ نہ پا سکیں اور جنھیں ہمارے مورخ اور نقاد خواتین کا ایک حصہ بنا کر بھگتا دیتے ہیں۔ اس لیے ضرورت ہے کہ ادب کی تاریخ از سرِ نو مرتب کی جائے اور نسائی مورخ کو یہ نئی تاریخ مرتب کرنے کا چیلنج قبول کرنا چاہیے۔

ان سب مسائل و مباحث کے علاوہ بعض چھوٹی چھوٹی باتیں ایسی ہیں جو نسائی نقاد کے لیے دشواریاں پیدا کر دیتی ہیں۔ مثال کے طور پر شدید نظریاتی وابستگی بعض اوقات نقاد کو شدید جذباتی ردِ عمل پر اکسا دیتی ہے اور طنز، اشتعال اور جھنجھلاہٹ تحریر میں در آتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ نسائیت کے بعض رجحانات ہماری سوسائٹی میں Taboo ہیں اور ان پر لکھنے کے لیے نقاد کو بہت احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے۔

ان سب مسائل و مباحث سے ایک ضمنی بحث یہ بھی نکلتی ہے کہ کیا Gender System ہی سارے مسائل کی جڑ ہے؟ ہمارے معاشرے کا فیوڈل ازم ایک ایسی صورتِ حال تشکیل دیتا ہے جس میں

ایک شخص ایک سطح پر ظالم اور وہی شخص دوسری سطح پر مظلوم بن جاتا ہے۔ اس صورتِ حال میں تبدیلی کے لیے سماج کے بنیادی ڈھانچے کے ساتھ رشتوں کی نوعیتیں بھی تبدیل کرنا ہوں گی۔ اس کے بعد ایک ایسا معاشرہ اور ایک نظام قائم ہو سکے گا جس کی بنیاد مساوات پر رکھی گئی ہو۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ نسائی نقاد کس حد تک زندگی کے حقائق سے آنکھ ملانے کی ہمت رکھتا ہے؟

حواشی

۱ Britannica Concise Encyclopedia.
http://www.britannica.com/feminism retrieved on 27-11-08.

۲ Cornell Drucilla, at the Heart of Freedom; Feminsm, Sex & Equality. Princeton University Press, Princeton NJ-1998.

۳ "Feminism" Merrium-Webster Online Dictionary 2008.
http:/www.merrium-webster.com/dictionary/feminism retrieved on 27-11-08.

۴ "A Dictionary of Feminist Theory" by Humm, Maggie__ The Women press, London 1989.

۵ Judith Fetterly, "The resisting reading__ A feminist approach to American fiction"-1977.

۶ Feminist Literary Studies: An Introduction by K.K Ruthven Cambridge University Press.

۷ ایضاً

۸ ایضاً

۹ ایضاً

۱۰ ''عورتوں کی محکومیت'' ترجمہ افتخار شروانی مطبوعہ فیروز سنز لاہور۔۱۹۹۳ء۔

۱۱ Our work, Our lives, Our Words: Women's History, Women's work, Macmillan, London, 1986, edited by David Off, Leonre & Westove.

۱۲ ایک طویل مضمون جو کتابی صورت میں شائع ہوا اس مضمون میں ورجینیا وولف کے نے اپنے لیکچرز کی ایک سیریز کو کتابی صورت دی۔

۱۳ Elain Showalter, "Towards feminist poetics: Women writing and writing about women" in The New Feminist Criticism", Random House 1988.

۱۴ i) "Three Wave Concept:, Collins Dictionary and Thesaurus, Collins, London, 2006.

ii) Dictionary of Feminist Theory by Maggie Humm, Ohio University Press, 1990.

۱۵ Alvin Toffler, The Third Wave.

۱۶ عورت، مذہب اور حکومت۔ سیّد شرافت حسین شرافت مطبوعہ نسیم بک ڈپو، لاہور، ص ۱۵۔

۱۷ ڈاکٹر مبارک علی، ''تاریخ اور عورت'' مطبوعہ فکشن ہاؤس لاہور ۱۹۹۶ء، ص ۴۸۔

۱۸ ڈاکٹر مہر عبدالحق، ''ہندو صنمیات'' مطبوعہ بیکن بکس، ۱۹۹۳ء، ص ۳۱۳۔

۱۹ ''آجکل'' دہلی۔ بدھ نمبر، پبلی کیشنز ڈویژن۔ نومبر ۱۹۵۶ء بحوالہ ''اُردو ناول میں تانیثیت۔ ڈاکٹر عقیلہ جاوید مطبوعہ شعبۂ اُردو۔ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان ۲۰۰۵ء۔

۲۰ "Muslim Feminism & Feminist Movement in Central Asia" by R. Khanam, edited by Abida Samiuddin, Published by Global Vision House, Jan 2002.

۲۰ ''فیمی نزم اور ہم۔ ادب کی گواہی''، مرتبہ فاطمہ حسن، مطبوعہ وعدہ کتاب گھر، شاہ فیصل کالونی، کراچی۔

۲۲ Unveiling the issues, edited by Nighat Saeed Khan, published by ASR Publication, Lahore.

۲۳ ڈاکٹر سلیم اختر۔ پاکستان شاعرات تشخیص کی تلاش میں، قومی زبان کراچی، ستمبر ۲۰۰۸ء۔

فہرستِ اسنادِ محولہ:

۱۔ جان اسٹورٹ مل، مترجم، افتخار شروانی: عورتوں کی محکومیت، مطبوعہ فیروز سنز، ۱۹۹۳ء۔

۲۔ جاوید اختر، ڈاکٹر: ''اُردو کی ناول نگار خواتین''، بہاول پور۔

۳۔ سبطِ حسن: ''پاکستان میں تہذیب کا ارتقا''، گیارھواں ایڈیشن، کراچی، مکتبۂ دانیال، ۲۰۰۶ء۔

۴۔ عابدہ سمیع الدین: ''ہندوستان کی جنگِ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ''، پٹنہ، اکادمی پبلیشر، ۱۹۹۶ء۔

۶۔ عصمت جمیل، ڈاکٹر: ''اُردو افسانہ اور عورت''، ملتان، شعبۂ اُردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، ۲۰۰۱ء۔

۷۔ عظمیٰ فرمان، ڈاکٹر: ''اُردو کی ادبی تحقیق وتنقید میں خواتین کا حصہ''، کراچی، کراچی یونیورسٹی، ۲۰۰۰ء۔

۸۔ عقیلہ جاوید، ڈاکٹر: ''اُردو ناول میں تانیثیت''، ملتان، شعبۂ اُردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ۲۰۰۵ء۔

۹۔ فتح پوری، فرمان، ڈاکٹر، امراؤ طارق: ''ادا جعفری۔ فن اور شخصیت''، کراچی، حلقۂ نیاز ونگار، ۱۹۹۸ء۔

۱۰۔ کشور ناہید: ''عورت زبانِ خلق سے زبانِ حال تک''، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء۔

۱۱۔ کشور ناہید: ''ورق ورق آئینہ''، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء۔

۱۲۔ مبارک علی، ڈاکٹر: ''تاریخ اور عورت''، لاہور، فکشن ہاؤس، ۱۹۹۶ء۔

۱۳۔ محمد مجیب: ''تاریخ تمدنِ ہند (عہدِ قدیم)''، حیدرآباد دکن، عثمانیہ یونیورسٹی پریس، ۱۹۵۱ء۔

۱۴۔ Elaine Showalter, "A Literature of Their Own" Published by Virago and Princeton University Press 1982.

۱۵۔ Josephine Donovan, "Feminist Literary Criticism: Exploration in Theory Edition" Published by University Press of Kentucky 1975.

۱۶۔ Nighat Saeed Khan, Rubina Sehgal, Afia Shehrbano, "A Celebration of Women", Vol-VI, Published by ASR Publication, Lahore, 1995.

۱۷۔ ------"Women's Dictionary of Symbols and Sacred Objects" Harper & Row, Sanfrancisco 1988.

مجلّہ:

''عصری ادب''، خواتین نمبر، دہلی، اپریل تا اکتوبر، ۱۹۸۰ء۔

O ------- O